Electronic Research Journal of Social Sciences and Humanities
ISSN: 2706 – 8242 www.eresearchjournal.com
Vol 8: Issue I
Jan-Mar 2026

بند دروازوں کے پیچھے سسکتی انسانیت

محمد محسن اقبال

Muhammad Mohsin Iqbal
Director General Research, National Assembly Secretariat, Parliament House, Islamabad, Pakistan
Email: mohsin.iqbal@na.gov.pk

مئی اور جون کی دوپہریں جب آسمان سے آگ برساتی ہیں اور سایہ بھی پناہ مانگتا دکھائی دیتا ہے، تب بھی اس ملک کے لاکھوں ہاتھ رکتے نہیں۔ کہیں کوئی محنت کش دہکتے تندور کے منہ پر جھکا روٹیاں لگا رہا ہوتا ہے، اور اس کے چہرے پر آگ کی تپش اور ماتھے پر پسینے کے قطرے ایک ساتھ چمک رہے ہوتے ہیں۔ کہیں تپتی سڑک پر کوئی مزدور پتھر توڑ رہا ہے، بوجھ ڈھو رہا ہے اور ہر سانس کے ساتھ اپنی تھکن نگل رہا ہے۔ انہی میں سے ہزاروں ایسے ہیں جو اپنی ماں کی دعاؤں، بیوی کی آنکھوں اور بچوں کی معصوم ہنسی کو پیچھے چھوڑ کر خلیجی ممالک کا رخ کرتے ہیں، جہاں پچاس ڈگری سے زیادہ کی گرمی میں بلند عمارتوں کی منڈیروں پر لٹکے وہ اپنی جوانی کے قیمتی برس دوسروں کے شہر سنوارنے میں گزار دیتے ہیں۔ ان سب کا خواب ایک ہی ہوتا ہے کہ گھر کا چولہا جلتا رہے، بچوں کے ہاتھ میں کتاب ہو اور خاندان عزت کی روٹی کھا سکے۔ غربت انسان سے بہت کچھ سہلوا لیتی ہے، اسی لیے یہ لوگ شکوہ کیے بغیر اپنی مشقت کو تقدیر کا لکھا سمجھ کر قبول کر لیتے ہیں۔

مگر انسانی دکھوں کی اس طویل داستان کا سب سے سیاہ باب وہ ہے جہاں ان لوگوں کا استحصال کیا جاتا ہے جن کی نہ کوئی آواز ہے، نہ کوئی سفارش اور نہ ہی اپنے حق کے لیے لڑنے کا کوئی وسیلہ۔ ہمارے ملک کے کئی علاقوں میں اینٹوں کے بھٹوں پر کام کرنے والے خاندان آج بھی نسل در نسل قرض کی ایسی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں جو باپ سے بیٹے اور بیٹے سے پوتے کو ورثے میں ملتی ہیں۔ ان کی محنت نچوڑ لی جاتی ہے، ان کی آزادی چھین لی جاتی ہے اور ان کی عزتِ نفس کو روند دیا جاتا ہے، جیسے وہ انسان نہیں بلکہ کسی کی جاگیر کا حصہ ہوں۔ دل اس وقت اور بھی دکھتا ہے جب یاد آتا ہے کہ یہ سب ایک ایسے معاشرے میں ہو رہا ہے جو صبح شام رحم، اخلاق اور دینی اقدار کی بات کرتا ہے۔

ستم یہ ہے کہ یہ ظلم اب صرف دور دراز دیہات، جاگیرداروں کی حویلیوں یا سرداروں کے ڈیروں تک محدود نہیں رہا۔ دیہی علاقوں میں مزارعوں اور کمیوں کے ساتھ غلاموں جیسا سلوک کوئی نئی کہانی نہیں، اور اکثر اسے رسم و رواج یا روایت کا لبادہ اوڑھا دیا جاتا ہے۔ لیکن کوئی رسم، کوئی روایت اور کوئی سماجی جواز کسی انسان کو یہ حق نہیں دیتا کہ وہ دوسرے انسان کی تذلیل کرے یا اس کی آزادی سلب کرے۔ افسوس کہ یہی سوچ اب بڑے شہروں کے ان عالی شان بنگلوں کی اونچی دیواروں اور مضبوط دروازوں کے پیچھے بھی پنپ رہی ہے جہاں دولت اور مرتبے کو دوسروں پر بے لگام اختیار کا اجازت نامہ سمجھ لیا گیا ہے۔

اس استحصال کا سب سے المناک چہرہ وہ کم سن گھریلو ملازم بچے ہیں، خصوصاً گیارہ سے سترہ برس کی وہ بچیاں جن کی عمر گڑیوں سے کھیلنے اور اسکول کے بستے اٹھانے کی ہوتی ہے۔ غربت کے ہاتھوں مجبور والدین اپنی بیٹیوں کو دور دیہات سے شہروں میں بھیج دیتے ہیں۔ انہیں معمولی ماہانہ تنخواہ، کھانے اور رہائش کے ساتھ

یہ یقین بھی دلایا جاتا ہے کہ بیٹی کی شادی کا خرچ بھی مالکان اٹھائیں گے۔ ایک ایسے باپ کے لیے، جس کے گھر میں کئی کئی دن چولہا ٹھنڈا رہتا ہو، یہ وعدہ کسی نعمت سے کم نہیں ہوتا۔ وہ دل پر پتھر رکھ کر اپنی لاڈلی کا ہاتھ کسی اجنبی کے ہاتھ میں تھما دیتا ہے، اور ماں دروازے کی چوکھٹ پر کھڑی دیر تک اس ننھی سی جان کو جاتا دیکھتی رہتی ہے، اس امید پر کہ شاید وہاں اسے تحفظ ملے، پیٹ بھر کھانا ملے اور زندگی کچھ آسان ہو جائے۔

لیکن امید کا یہ سفر اکثر خوف، اذیت اور تذلیل کی داستان بن جاتا ہے۔ منہ اندھیرے سے آدھی رات تک وہ بچی ایک گھر کی خدمت میں جتی رہتی ہے۔ اس سے بچپن کی ہنسی، کھیلنے کی آزادی، تعلیم کا حق اور کبھی کبھی چند لمحوں کا آرام بھی چھین لیا جاتا ہے۔ وہ اسی گھر کے بچوں کو اسکول جاتے دیکھتی ہے، انہیں کھلونوں سے کھیلتے دیکھتی ہے، اور خود ان کے جوٹھے برتن دھوتی ہے۔ کسی برتن کا ہاتھ سے پھسل کر ٹوٹ جانا، کسی بے جا حکم کی تعمیل میں ذرا سی دیر، یا تھکن سے آنکھ لگ جانا اس کے لیے گالیوں، تھپڑوں اور تشدد کا سبب بن جاتا ہے۔ اور بعض دل دہلا دینے والے واقعات میں یہ درندگی ایک معصوم زندگی کا چراغ ہی گل کر دیتی ہے۔

ایسی خبریں آئے روز ہمارے ضمیر کا دروازہ کھٹکھٹاتی ہیں۔ طبی معائنوں اور پوسٹ مارٹم رپورٹس میں سامنے آنے والے حقائق اتنے لرزہ خیز ہوتے ہیں کہ پڑھنے والے کا کلیجہ منہ کو آ جاتا ہے۔ ننھے جسم پر نیل، جلنے کے داغ اور زخموں کے نشان وہ کہانی سناتے ہیں جو وہ بچی زندگی میں کبھی کسی کو سنا نہ سکی۔ شاید اس نے کئی راتیں اپنی ماں کو یاد کر کے روتے ہوئے گزاری ہوں، شاید ہر روز یہ سوچ کر جاگتی ہو کہ کب ابا اسے لینے آئیں گے۔ اس کی خاموش موت ان لوگوں کے خلاف سب سے بلند گواہی بن جاتی ہے جنہیں اس کی حفاظت سونپی گئی تھی اور جنہوں نے اسی امانت میں خیانت کی۔

اس سے بھی زیادہ تکلیف دہ پہلو یہ ہے کہ ایسے بہت سے مقدمات میں انصاف کا راستہ اثر و رسوخ، دھمکیوں اور دولت سے روک دیا جاتا ہے۔ وہ خاندان جو پہلے ہی غربت اور بے بسی کے بوجھ تلے دبا ہوتا ہے، کبھی خوف سے، کبھی پیسوں کے لالچ سے اور کبھی بااثر لوگوں کے دباؤ سے خاموش کرا دیا جاتا ہے۔ یوں ایک معصوم کی موت انصاف کا مقدمہ بننے کے بجائے سودے بازی کی میز پر پہنچ جاتی ہے، جیسے کسی بیٹی کی جان کی قیمت لگائی جا سکتی ہو۔ معاشرہ چند دن احتجاج کرتا ہے، ٹی وی پر بحثیں ہوتی ہیں، اخبارات میں سرخیاں لگتی ہیں، اور پھر سب کچھ بھلا دیا جاتا ہے، یہاں تک کہ کوئی اور ننھی جان اسی ظلم کی بھینٹ چڑھ جاتی ہے۔

یہ محض گھریلو ملازمت یا مزدوری کا معاملہ نہیں بلکہ ہماری اجتماعی انسانیت، انصاف اور اخلاق کا امتحان ہے۔ آئینِ پاکستان ہر شہری کے وقار، استحصال سے تحفظ اور بچوں کے حقوق کی ضمانت دیتا ہے، مگر قانون کی کتابوں کے یہ الفاظ اس وقت بے معنی ہو جاتے ہیں جب کسی بااثر شخص کی چار دیواری میں ایک بچی ظلم سہتی رہے اور قانون کے ہاتھ وہاں تک نہ پہنچ سکیں۔ ریاست کا فرض ہے کہ وہ مؤثر نگرانی اور معائنے کا نظام بنائے، ایسے واقعات کی فوری اور غیر جانب دارانہ تحقیقات کرے، متاثرہ بچوں کو تحفظ دے اور مجرموں کو ایسی سزا دے جو دوسروں کے لیے عبرت بن جائے۔ کسی کا گھر ظلم کی پناہ گاہ نہیں بننا چاہیے۔

والدین کو بھی یہ سمجھنا ہوگا کہ بچے کا مستقبل سنوارنے کے لیے اس کا بچپن اجنبیوں کے حوالے نہیں کیا جا سکتا۔ غربت یقیناً انسان کو کڑے فیصلوں پر مجبور کرتی ہے، مگر اس کا حل بچوں کو استحصال کی بھٹی میں جھونکنا نہیں بلکہ خاندانوں کو تعلیم، سماجی تحفظ اور باعزت روزگار فراہم کرنا ہے۔ معاشرے اور ریاست دونوں کی ذمہ داری ہے کہ ایسے حالات پیدا کریں جن میں کسی ماں باپ کو اپنی بیٹی کی مسکراہٹ اور گھر کے چولہے میں سے کسی ایک کا انتخاب نہ کرنا پڑے۔

اس موقع پر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے منسوب وہ قول دل پر دستک دیتا ہے کہ اگر دریائے فرات کے کنارے ایک کتا بھی پیاس سے مر گیا تو قیامت کے دن عمر سے اس کا بھی سوال ہوگا۔ جس دین اور تاریخ میں ایک بے زبان جانور کی پیاس بھی حکمران کی جواب دہی سے باہر نہ ہو، اس کے ماننے والے ان معصوم

بچیوں کی سسکیوں سے کیسے بے نیاز رہ سکتے ہیں جنہیں ان کے والدین نے تحفظ کی امید پر دوسروں کے سپرد کیا تھا؟ سوال صرف یہ نہیں کہ ظالموں نے کیا کیا، سوال یہ بھی ہے کہ ہم نے اپنی خاموشی اور بے حسی سے اس ظلم کو پنپنے کیوں دیا؟

کوئی قوم محض بلند عمارتوں، شاندار بنگلوں، کشادہ سڑکوں اور جگمگاتے بازاروں سے مہذب نہیں کہلاتی۔ تہذیب کا اصل پیمانہ یہ ہے کہ وہ اپنے کمزور، بے وسیلہ اور بے آواز لوگوں کے ساتھ کیسا سلوک کرتی ہے۔ ہماری روٹی پکانے والے ہاتھ، ہماری عمارتیں کھڑی کرنے والے بازو اور ہمارے گھروں کو سنوارنے والے محنت کش احترام کے حق دار ہیں، استحصال کے نہیں۔ اور سب سے بڑھ کر، ہر بچہ محبت، تحفظ، تعلیم اور جینے کے حق کا مستحق ہے۔

اب وقت آ گیا ہے کہ ہم صرف ان گھروں کے بند دروازے ہی نہ کھولیں بلکہ اپنے ضمیر کے بند دریچے بھی وا کریں۔ کیونکہ جس معاشرے میں بے بسوں کی چیخیں دلوں کو نہ ہلا سکیں اور معصوموں کے آنسو ضمیر کو نہ جگا سکیں، وہاں سب سے بڑا المیہ غربت نہیں بلکہ انسانیت کی موت ہوتا ہے۔